ڈاکٹر خالد ندیم
اسسٹنٹ پروفیسر اردو، جامعہ سرگودھا

اقبال کی مرثیہ نگاری

The Poet of the East, Iqbalbegan his poetry by composing ghazals. After that, he composed lyrics for a long time. He did not focus on particular type or genre of poetry. He has no special aptitude for elegy but inspite of that he wrote fifteen elegies. Now ten elegies are part of his published books, nine in Baang-e-Dara and one in Armughan-e-Hijaz. The elegies written by Iqbal are not traditional mourning; rather they contain anoptimist strain. In the present paper, this aspect of Iqbal's elegies has been emphasized.

عربی زبان میں بنیادی صنفِ سخن قصیدہ رہی ہے، جو مدح، ہجو اور مرثیہ کے لیے مستعمل تھی، بعد ازاں یہ تینوں اصناف الگ الگ ہوگئیں۔ مرثیہ عربی لفظ 'رثٰی' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں: مرنے والے کے لیے آنسو بہانا اور اس کے محاسن بیان کرنا؛ گویا مرثیہ کسی عزیز ہستی کے انتقال پر جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی مرثیے کو ایک ایسی صنف قرار دیتے ہیں، جس میں کسی مرنے والے کا ذکر اور اس کی تعریف، حسرت اور غم کے انداز میں کی جاتی ہے۔[1] حضرت آدم کی طرف سے اپنے بیٹے ہابیل کے لیے کہے جانے والے مرثیے سے اب تک دنیا کی ہر زبان اور ہر تہذیب میں اس کا چلن رہا ہے۔ اردو زبان میں مرثیے کے ابتدائی نقوش سولھویں صدی عیسوی کے دَوران دکن میں مل جاتے ہیں۔ پھر سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد اردو مرثیہ انیسویں صدی میں انیس و دبیر کے ہاتھوں اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ عربی و فارسی میں مذہبی و غیر مذہبی شخصیات کے لیے مرثیہ لکھا جاتا رہا، لیکن اردو میں یہ صنف شہیدانِ کربلا کے لیے مختص ہو کر رہ گئی تھی، البتہ مرزا غالب اور ان کے بعد خواجہ حالی نے مرثیہ گوئی کا میدان وسیع کر دیا۔

اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا، بعد میں ایک مدت تک ان کی توجہ کا مرکز فقط نظم رہی۔ اقبال کو کسی خاص صنفِ سخن سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی خاص صنف میں طبع آزمائی کی کوشش کرتے تھے۔ وہ کسی بھی صنفِ سخن کا تعین محض اپنے فکری مقاصد کے پیشِ نظر کرتے تھے۔ انھیں نظم کی کسی خاص ہیئت سے سروکار نہ تھا، بلکہ وہ اپنے افکار کے ابلاغ کے لیے بعض اوقات مروّجہ اصناف میں تصرف سے بھی کام لیتے رہے۔

یوں تو اقبال کے افکار اور ان کی لفظیات کو مرثیہ گوئی سے کوئی مناسبت نہ تھی، اس کے باوجود ان کے ہاں بعض شخصیات کی رحلت پر لکھی گئی نظمیں مل جاتی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے بانگِ درا کی نظم 'داغ' کی تشریح کے ذیل میں مرثیے سے متعلق اقبال کے ہاں چھے (۶) رثائی نظموں کی نشان دہی کی ہے، یعنی 'داغ'، 'صقلیہ'، 'گورستانِ شاہی'، 'فلسفہ غم'، 'والدۂ مرحومہ کی یاد میں' اور 'مسعود مرحوم'[2] پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے اقبال کے ہاں غالب، آرنلڈ، داغ اور والدہ مرحومہ کے مرثیوں کا ذکر کیا

ہے[۳] اور پروفیسر آفاق حسین صدیقی کے خیال میں: اقبال کے اردو کلام میں پانچ شخصی مرثیے ملتے ہیں: 'اشکِ خوں'، 'ماتمِ پسر'، 'داغ'، 'والدۂ مرحومہ کی یاد میں' اور 'مسعود مرحوم'۔[۴] واضح رہے کہ غالب اور آرنلڈ سے متعلق نظموں کو مرثیہ نہیں کہہ سکتے، کیوں کہ اوّل الذکر کے لیے لکھی گئی نظم انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے، جب کہ دوسری نظم آرنلڈ کی وفات پر نہیں، بلکہ ان کی برطانیہ واپسی پر ان کی جدائی سے مرتب ہونے والے درد و الم کا اظہار کرتی ہے۔ آرنلڈ کی وفات تو عرصہ بعد ۱۹۳۰ء میں ہوئی تھی ، اس لیے بانگِ درا کے حصہ اوّل (..... ۱۹۰۵ء تک) میں شامل مذکورہ نظم کو کسی طور مرثیہ نہیں کہا جاسکتا۔

اقبال کی رثائی نظموں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے؛ شخصی مرثیے اور مسلم تہذیب پر رثائی نظمیں۔ پہلے شخصی مرثیوں کا زمانی اعتبار سے تعارف کرایا جاتا ہے:

(۱) اشکِ خوں: ۲۲؍جنوری ۱۹۰۱ء کو ملکہ برطانیہ کا انتقال ہوگیا تو برطانوی ہند میں ان کا سوگ منایا گیا۔ اس فضا میں دیگر شعرا کے ساتھ ساتھ اقبال نے بھی ان کا ایک مرثیہ لکھا۔ اقبال کا یہ مرثیہ ان کے آئندہ کے سب مرثیوں سے طویل تر ہے، یعنی دس بندوں اور ایک سو دس اشعار پر مشتمل۔ یہ مرثیہ اقبال کے مجموعی کلام سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا، البتہ برطانوی ہندوستان کے ایک عام شہری (British subject) کے ذہن کا ترجمان ضرور ہے۔ آٹھ صفحات پر مشتمل یہ مرثیہ رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور کی طرف سے شائع ہوا، اس پر سنہ اشاعت درج نہیں۔ چار صفحات پر مبنی *Tear of Blood* کے نام سے اس مرثیے کا انگریزی ترجمہ مفید عام پریس لاہور سے ۱۹۰۱ء میں چھپا۔ اقبال نے اسے اپنے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں کیا۔[۵] اس مرثیے کا آخری شعر ملاحظہ کیجیے:

مرحوم کے نصیب ثوابِ جزیل ہو
ہاتھوں میں اپنے دامنِ صبرِ جمیل ہو

(۲) ماتمِ پسر: خواجہ عبدالصمد کٹڑو بارہ مولا کے رئیس اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے سرگرم رکن تھے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں بالخصوص شامل ہوتے اور کشمیری مسلمانوں کے لیے ہمیشہ پُر جوش رہتے تھے۔ ان کے نہایت ہونہار، چہیتے اور پابندِ صوم وصلوٰۃ فرزند خواجہ غلام حسن عالمِ شباب میں ۱۹۰۲ء میں داغِ مفارقت دے گئے تو اقبال نے ان کی وفات پر پندرہ اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ لکھا، جو مخزن کے شمارے جولائی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا، البتہ اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہ ہوسکا۔[۶] اس کا پہلا شعر دیکھیے:

اندھیرا صمد کا مکاں ہو گیا
وہ خورشیدِ رَوشن نہاں ہو گیا

(۳) داغ: انیسویں صدی کے آخری عشروں میں ہندوستان میں ایک طرف امیر مینائی (۱۸۲۹ء-۱۹۰۰ء) کی شاعری کی دھوم تھی اور دوسری جانب نواب مرزا داغ دہلوی (۱۸۳۱ء-۱۹۰۵ء) کی شاعری کا شہرہ تھا۔ اگرچہ بعد میں اقبال کی شاعری پر امیر کے اثرات بھی محسوس کیے گئے، لیکن ابتدائی طور پر اقبال نے داغ کا تلمذ اختیار کیا۔ ابھی اقبال ایف اے کے سالِ اوّل میں تھے، جب انھوں نے ایک خط اور اصلاح کی غرض سے چند غزلیں ان کی خدمت میں ارسال کیں۔ غالباً ۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۶ء تک ان سے مشورہ کرتے رہے، لیکن داغ سے ان کی بالمشافہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ اگرچہ داغ سے تلمذ کا یہ دورانیہ

نہایت مختصر رہا، لیکن اقبال داغ سے اپنی نسبت کا ہمیشہ اعتراف کرتے رہے؛ چناں چہ داغ کی وفات (۱۴؍فروری ۱۹۰۵ء) پر مخزن نے اپریل کے شمارے کو 'یادگارِ داغ نمبر' کے طور پر شائع کیا تو اس میں اقبال کا یہ مرثیہ شامل تھا۔[۷] یاد رہے کہ ستائیس اشعار پر مشتمل اس نظم کو بانگِ درا میں شامل کرتے وقت اس کے چار اشعار قلم زد کر دیے گئے۔[۸] یہ نظم اب بانگِ درا کے حصہ اوّل میں شامل ہے۔[۹] اس مرثیے کا نمائندہ شعر ملاحظہ کیجیے:

چل بسا داغ ، آہ! میت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

(۴) سوامی رام تیرتھ: رام تیرتھ (۱۸۷۳ء-۱۹۰۶ء) گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ فقر و فاقہ کے باوجود، میٹرک سے ایم اے (ریاضی) تک امتیازی حیثیتوں سے کامیابیاں حاصل کیں۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ حصولِ علم کے ساتھ تزکیہ باطن اور تربیتِ نفس کی طرف بھی توجہ رہتی تھی، مصائب و آلام کی بھٹی میں تپ کر ان کی شخصیت خوب سے خوب تر سانچے میں ڈھلتی رہی، [چناں چہ] تعلیم کے آخری مدارج تک پہنچتے پہنچتے وہ سلوک و معرفت کے کئی مقامات طے کر چکے تھے۔[۱۰] مختلف تعلیمی اداروں میں انتظامی اور تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۳؍مئی ۱۸۹۹ء کو گورنمنٹ کالج لاہور سے منسلک ہوئے۔ ایک سال سے کچھ زائد عرصے تک اقبال اور سوامی رام تیرتھ رفیقِ کار رہے۔ اقبال نے سوامی جی کی صحبت میں سنسکرت ادب اور ویدانتی فلسفے کا مطالعہ کیا تو سوامی رام بھی اقبال کی شخصیت اور شاعری سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ ان کے بعض اشعار اپنے مجموعۂ کلام رام برشا میں شامل کر لیے۔[۱۱] دونوں میں مخلصانہ تعلقات رہے، چناں چہ ۱۷؍اکتوبر ۱۹۰۶ء کو جب وہ گنگا میں نہاتے ہوئے ڈوب گئے اور اقبال کو انگلستان میں اس سانحے کی خبر ملی تو انھوں نے ان کی یاد میں یہ رثائی نظم لکھی، جو مخزن لاہور کے شمارے جنوری ۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی۔ یہ نظم اب بانگِ درا کے حصہ دوم میں شامل ہے۔[۱۲]

(۵) فلسفۂ غم: مخزن کے شمارے جولائی ۱۹۱۹ء میں شائع ہونے والی یہ نظم علامہ نے اپنے قدیم دوست اور ہم جماعت سر فضل حسین (۱۸۷۷ء- ۱۹۳۶ء) کے والد کی ناگہانی رحلت پر بطور تسلی نامہ لکھی۔ اب یہ نظم بانگِ درا کے حصہ سوم میں شامل ہے۔[۱۳]

(۶) فاطمہ بنت عبداللہ: جون ۱۹۱۲ء میں طرابلس میں اطالوی فوجوں سے جنگ کے دَوران زخمی مجاہدین کو پانی پلاتے ہوئے شہید ہونے والی بچی فاطمہ بنت عبداللہ کے بارے میں ۱۳؍نومبر ۱۹۱۲ء کو الہلال (جلد اوّل، ص ۱۸) میں ایک رپورٹ شائع ہوئی، جس کے ساتھ بچی کی رنگین تصویر بھی چھپی۔[۱۴] اقبال نے اس واقعے سے متاثر ہو کر یہ نظم تخلیق کی۔ یہ نظم بانگِ درا کے حصہ سوم میں شامل ہے۔[۱۵] حقیقت یہ ہے کہ فاطمہ کا کردار اقبال کی اس نظم ہی کے باعث آج تک زندہ ہے:

فاطمہ! تُو آبروے امتِ مرحوم ہے
ذرّہ ذرّہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

(۷) شبلی و حالی: مولانا شبلی سے اقبال کے استفادے کے کئی واقعات ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی زیرِ صدارت محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ایک اجلاس میں مولانا شبلی نعمانی کی طرف سے اقبال کی گُل پوشی کی رسم ایک یادگار واقعہ

ہے۔[۱۶] حالی اور اقبال فکری سطح پر ایک دوسرے سے کافی قریب رہے ہیں۔ اپریل ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام کے ایک جلسے میں حالی کی ضعیفی کے باعث ان کی نظم اقبال نے پڑھ کر سنائی۔ حالی سے اپنے تعلق کو اقبال نے یہاں تک نبھایا کہ شدید علالت کے باوجود، ۲۶/اکتوبر ۱۹۳۵ء کو حالی کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کے لیے پانی پت گئے۔ ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شبلی نعمانی انتقال کر گئے، اس کے بعد ۳۰/دسمبر ۱۹۱۴ء کو خواجہ الطاف حسین حالی بھی رحلت فرما گئے تو اقبال نے زیرِ بحث نظم[۱۷] کے ذریعے اس نقصانِ عظیم پر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

(۸) والدہ مرحومہ کی یاد میں: اقبال کی والدہ محترمہ امام بی، اپنے گھر میں 'بے جی' کہلاتی تھیں۔ اقبال کو فطری طور پر اپنی والدہ سے بہت محبت تھی اور دوسری طرف وہ بھی اپنے بیٹے کو بہت چاہتی تھیں۔ وہ ایک دین دار، نیک اور قناعت پسند خاتون تھیں۔ خاندانی معاملات میں منصف، ضرورت مند خواتین کا سہارا اور غریب گھرانوں کی بچیوں کی کفیل تھیں۔ اقبال ایف اے کے بعد ستمبر ۱۸۹۵ء میں گھر سے لاہور کی طرف روانہ ہوئے تو پھر ساری زندگی سیال کوٹ کو اپنا مستقر نہ بنا سکے۔ اسی دَوران اعلیٰ تعلیم کے لیے تین برس یورپ میں بھی گزارے۔ ۹/نومبر ۱۹۱۴ء میں امام بی کا انتقال ہوا تو ان کی عمر ۷۸ سال تھی۔ اس وقت خود اقبال ۳۷ برس کے ایک جہاں دیدہ اور سنجیدہ انسان تھے، تاہم والدہ کی وفات پر کئی مہینوں تک دل گرفتہ رہے اور نتیجہ فکر کے طور پر انھوں نے یہ رثائی نظم[۱۸] کہی، جس کا درج ذیل شعر اردو کے نہایت معروف اشعار میں شمار ہوتا ہے:

آسماں تیری لحد بر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نَو رُستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

(۹) ہمایوں: شاہ دین ہمایوں انگلستان سے بیرسٹری کر کے آئے تو پنجاب یونی ورسٹی کی مجلس انتظامیہ کے رکن نامزد ہوئے۔ اپنی ذہانت سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دو مرتبہ صدر چنے گئے، مجلس وضع قوانین پنجاب کے رکن بنے اور پھر چیف کورٹ لاہور میں جج مقرر ہوئے۔ شاہ دین ہمایوں سے اقبال کے تعلقات نہایت مخلصانہ رہے۔ ۲/جولائی ۱۹۱۸ء کو ہمایوں کا انتقال ہو گیا تو اقبال نے اپنے جذباتِ غم کا اظہار اس نظم[۱۹] میں کیا۔ اس کا آخری شعر ملاحظہ کیجیے:

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

(۱۰) لسان العصر اکبر مرحوم: دسمبر ۱۹۱۰ء میں اقبال نے ایم اے او کالج علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں ایک خطبہ (Muslim Community) دیا، جس کے بعد اکبر و اقبال کے درمیان خط کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اکبر کے نام اقبال کا پہلا دستیاب خط ۶/اکتوبر ۱۹۱۱ء کو تحریر ہوا اور دونوں کی پہلی ملاقات جنوری ۱۹۱۳ء میں الٰہ آباد میں ہوئی۔ اقبال کی والدہ کی رحلت پر اکبر نے فارسی اور اردو نظموں کی صورت میں مادّہ تاریخ لکھا۔ اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد خواجہ حسن نظامی کے ساتھ ساتھ اکبر بھی اقبال کے خیالات پر معترض ہوئے، البتہ بعد میں انھی کی کوششوں سے یہ معرکہ آرائی اپنے اختتام کو پہنچی۔ اقبال، اکبر کو نہ صرف یہ کہ اپنا پیش رو سمجھتے تھے، بلکہ وہ اکبر کو ایک مرید کی نگاہ سے دیکھتے تھے، چنانچہ اکبر کی رحلت (۹/ستمبر ۱۹۲۱ء) پر اقبال نے بزبانِ فارسی ایک رثائی نظم لکھی، جو اکبر سے اقبال کے گہرے قلبی تعلق کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ نظم

اوّل اوّل پیامِ مشرق میں (طبع اوّل، ص ۱۱۹) شامل ہوئی، البتہ دوسرے اڈیشن سے اسے حذف کر دیا گیا۔ واضح رہے کہ سرودِ رفتہ (ص ۱۹۳) اور باقیاتِ اقبال (۲۳۹) کے مؤلفین نے اس نظم کو 'مرثیہ اکبر الٰہ آبادی' کا نام دیا ہے۔

(۱۱) مولانا شیخ غلام قادر گرامی شملہ، کپورتھلہ، امرتسر اور لدھیانہ میں فارسی کے مدرس رہے، بعد ازاں حیدرآباد دکن کے حکمرانوں میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خاں کے دربار میں 'شاعرِ خاص' کی حیثیت سے ۱۹۱۶ء-۱۹۱۷ء تک بڑی شان سے رہے۔ واپس آ کر ہوشیار پور میں مقیم ہوئے۔ اقبال سے ان کی ملاقاتوں کی تفصیل اور خط کتابت کے علاوہ، خان نیاز الدین خاں کے نام اقبال کے بعض خطوط سے بھی اقبال اور گرامی کی بے تکلفی کا پتا چلتا ہے۔ ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو گرامی کا انتقال ہو گیا تو اقبال کو شدید رنج ہوا، چنانچہ اپنے عزیز دوست کے غم میں بزبانِ فارسی ایک نظم لکھی۔ یہ نظم اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہ ہو سکی [۲۰]، لیکن اقبال کے دردِ دل کی ترجمان ضرور ہے:

بر مزارش پست تر کن پردہ ہاے ساز را
تا نہ گردد خواب او آشفتہ از شور نواے

(۱۲) مولانا محمد علی جوہر اردو اور انگریزی کے اعلیٰ پائے کے ادیب، شاعر اور تحریک آزادیِ ہند کے ایک پُرجوش اور سرگرم رہنما رہے اور اس سلسلے میں انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ محمد کاظم کے خیال میں، مولانا جوہر کا جذبہ بعض مواقع پر جذباتیت کی صورت اختیار کر جاتا تھا [۲۱]، چنانچہ تحریکِ خلافت کے دَوران وہ عالمی سیاسی صورتِ حال کا صحیح ادراک نہ کر سکے۔ اقبال اس تحریک سے کنارہ کش رہے تو جوہر انھیں 'اقبال مرحوم' لکھنے لگے۔ اس کے باوجود، وہ اقبال کے قدر دان تھے اور دونوں میں بے تکلفی کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں جوہر کا انتقال ہو گیا تو اقبال نے بزبانِ فارسی ایک رثائی نظم لکھی، لیکن یہ نظم ان کے کسی مجموعہ کلام کا حصہ نہ بنی۔ [۲۲]

(۱۳) مسعود مرحوم: ۱۸ نومبر ۱۹۲۹ء کو علامہ انگریزی خطبات کے لیے ایک ہفتہ علی گڑھ مقیم رہے، جس دَوران سرسید احمد خان کے پوتے اور علی گڑھ یونی ورسٹی کے وائس چانسلر، راس مسعود سے ان کے تعلقات استوار ہو گئے، جو تاحیات مضبوط و مستحکم رہے۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں افغان حکمران نادر شاہ کی دعوت پر مشترکہ دورۂ افغانستان سے دونوں کے تعلقات مزید گہرے ہو گئے۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں اقبال کی علالت کا آغاز ہوا، اسی دَوران راس مسعود علی گڑھ سے مستعفی ہو کر تعلیمات و امورِ مذہبی کے ناظمِ اعلیٰ کی حیثیت سے بھوپال آ چکے تھے، انھیں معلوم ہوا تو انھوں نے اقبال کو برقی علاج کے لیے بھوپال آنے کی دعوت دی، چنانچہ ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء میں تین مرتبہ اقبال بغرضِ علاج بھوپال گئے اور کئی کئی ہفتے وہاں قیام پذیر رہے۔ راس مسعود نے ریاست بھوپال کی طرف سے اقبال کے لیے پانچ سو روپے ماہوار کا وظیفہ بھی مقرر کرایا۔ اقبال خود بیماریوں سے نبرد آزما تھے کہ مختصر علالت کے بعد ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو راس مسعود خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اس صدمے کا اقبال پر گہرا اثر ہوا اور انھوں نے اپنے جذبات کا اظہار ایک نظم 'مسعود مرحوم' [۲۳] کے ذریعے کیا۔ ۷ اگست ۱۹۳۷ء کو ممنون کے نام ایک خط میں اقبال نے لکھا کہ مسعود کا غم باقی رہے گا، جب تک مَیں باقی ہوں۔ [۲۴]

.....

اب مسلم تہذیب پر لکھی گئی ان کی دو رثائی نظموں کا تعارف:

(۱) صقلیہ: اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد ۳۱/ جولائی ۱۹۰۸ء کو انگلستان سے واپس ہندستان روانہ ہوئے۔ رات کے وقت ان کا جہاز جب اٹلی کے جزیرے سسلی کے قریب سے گزرا(جہاں مسلمانوں نے ایک مدت تک تہذیب کی روشنی پھیلائی تھی) تو اس کے ساحل کی روشنیوں کو دیکھ کر بعض خیالات اور جذبات نے یکا یک ان کی طبیعت پر ہجوم کیا۔ یہ نظم انھی خیالات و جذبات کا ثمر ہے۔ یہ نظم اوّل اوّل مخزن (اگست ۱۹۰۸ء، ص۶۳) میں شائع ہوئی، اب بانگِ درا کے حصہ دوم میں شامل ہے۔[۲۵] اس رثائی نظم کا پہلا شعر شاعر کے تمام جذبات کی بھرپور عکاسی کرنے کے لیے کافی ہے:

رو لے اب دل کھول کر ، اے دیدۂ خونابہ بار!
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

(۲) گورستانِ شاہی: اقبال ۱۸/ مارچ ۱۹۱۰ء کو حیدرآباد کے سفر پر روانہ ہوئے اور ۲۸/ مارچ ۱۹۱۰ء کو واپس لاہور پہنچے۔ حیدرآباد میں قیام کے دَوران ریاستی محکمہ خزانہ کے معتمد نذر علی حیدری انھیں شہر سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ، بقول علامہ اقبال: اُن شاندار، مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے، جن میں سلاطینِ قطب شاہیہ سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں سے چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُرحسرت منظر کے ساتھ مل کر علامہ کے دل پر ایسا اثر کیا، جو انھیں کبھی فراموش نہ ہو سکا۔ یہ نظم انھی تاثرات کا ایک اظہار ہے۔ یہ نظم مخزن کے شمارے جون ۱۹۱۰ء (ص ۲۰۱) میں شائع ہوئی اور اب بانگِ درا کے حصہ سوم میں شامل ہے۔[۲۶] درج ذیل شعر اس نظم کا مرکزی خیال تصور کیا جا سکتا ہے:

ہو چکا گو قوم کی شانِ جلالی کا ظہور
ہے مگر باقی ابھی شانِ جمالی کا ظہور

.....

اردو میں مرثیے کے لیے کوئی خاص ہیئت متعین نہیں تھی، چنانچہ اوّل اوّل یہ غزل کی ہیئت میں لکھا گیا، پھر مثلث، مثنوی، مربع، مخمس، ترکیب بند اور ترجیع بند میں بھی طبع آزمائی کی گئی۔ مرزا رفیع سودا نے دیگر ہیئتوں کے ساتھ ساتھ مسدس میں بھی مرثیے لکھے تو مرثیہ نگاری کے لیے یہ ہیئت مقبول ہو گئی اور میر خلیق سے انیس و دبیر تک کوئی اس کے حصار سے نہ نکل سکا۔ اس کے بعد مرثیہ اور مسدس لازم و ملزوم ہو گئے۔ لیکن حالی نے سات مرثیوں میں سے صرف ایک کے لیے مسدس کی ہیئت اختیار کی گئی (ایک ترکیب بند اور پانچ قطعات)۔ اقبال نے اپنی افتادِ طبع کے زیرِ اثر اس ہیئت سے مکمل انحراف کیا، چنانچہ ان کے مرثیوں میں سے 'ماتمِ پسر' غزل کی ہیئت میں ہے؛ 'شبلی و حالی'، 'لسان العصر اکبر مرحوم' کے علاوہ مولانا شیخ غلام قادر گرامی اور مولانا محمد علی جوہر کے مرثیے قطعہ ؛ 'اشکِ خوں'، 'داغ' اور 'مسعود مرحوم' ترکیب بند اور 'سوامی رام تیرتھ'، 'صقلیہ '، 'گورستانِ شاہی'، 'فلسفۂ غم'، 'فاطمہ بنت عبداللہ'، 'والدۂ مرحومہ کی یاد میں' اور 'ہمایوں' مثنوی کے ہیئت میں۔ یاد رہے کہ مثنوی کی ہیئت میں ہونے کے باوجود، یہ نظمیں مثنوی کی مروّجہ بحروں کی پابند نہیں ہیں اور پھر یہ کہ ان کی نظم 'داغ' میں خیال کے لحاظ سے بند تشکیل دیے گئے ہیں، یہ بند ان کی دیگر

ترکیب بند نظموں کی طرح اشعار کی کسی مخصوص تعداد کے حامل نہیں۔

مذکورہ بالا پندرہ نظموں میں سے دس ان کے متداول مجموعوں میں شامل ہیں، جن میں سے پہلی نو نظمیں بانگِ درا میں شامل ہیں، جب کہ اس سلسلے کی آخری نظم 'مسعود مرحوم' کے نام سے ارمغانِ حجاز (اردو) کا حصہ ہے۔

ہمایوں، اکبر، گرامی اور جوہر کے انتقال پر لکھے گئے مرثیے پانچ پانچ اشعار پر مبنی ہیں اور انھیں اقبال کے مختصر مرثیے کہا جا سکتا ہے، جب کہ سب سے طویل مرثیہ 'اشکِ خون' ملکہ برطانیہ کے انتقال پر لکھا گیا، جو ایک سو دس اشعار کو محیط ہے؛ البتہ متداول مرثیوں میں سب سے طویل مرثیہ 'والدۂ مرحومہ کی یاد میں' ہے، جو چھیاسی اشعار پر مشتمل ہے۔ دیگر نظمیں 'سوامی رام تیرتھ' چھے، 'شبلی و حالی' دس، 'فاطمہ بنت عبداللہ' بارہ، 'ماتمِ پسر' پندرہ، 'صقلیہ' سترہ 'مسعود مرحوم' اکیس، 'داغ' تئیس، 'فلسفہ غم' بتیس اور 'گورستانِ شاہی' اٹھاون اشعار کی حامل ہیں؛ گویا اقبال نے مرثیے کے ضمن میں کُل چار سو چالیس اشعار کہے۔

تعلق کے اعتبار سے ان مرثیوں میں تیرہ شخصی اور دو غیر شخصی مرثیے ہیں۔ شخصی مرثیوں میں ایک اپنی والدہ کی جدائی پر، تین نظمیں شعرا (داغ، حالی، اکبر) کی رحلت پر، پانچ اپنے دوستوں (سوامی رام تیرتھ، ہمایوں، گرامی، جوہر اور سر راس مسعود) کی وفات، ایک حکومتی شخصیت (ملکہ برطانیہ) کی موت پر، ایک اپنے دوست کے والد کے انتقال پر، ایک کم سن مسلمان بچی کی شہادت پر، جب کہ غیر شخصی مرثیوں میں دو نظمیں مسلمانوں کی عظمت رفتہ پر لکھی گئیں۔ ان سب مرثیوں میں صرف 'والدۂ مرحومہ کی یاد میں' ایسی نظم ہے، جس میں اقبال نے براہِ راست تعلق کی بنیاد پر اپنے ذاتی تجربے کو نظم کیا ہے۔

آٹھ مرثیے ('ماتمِ پسر'، 'سوامی رام تیرتھ'، 'فاطمہ بنت عبداللہ'، 'شبلی و حالی'، 'ہمایوں'، 'لسان العصر اکبر مرحوم'، 'گرامی'، جوہر) یک تاثری ہیں۔ 'ماتمِ پسر' میں خواجہ عبدالصمد کے جذبات کو قلم بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے، 'سوامی رام تیرتھ' میں اپنے ہندو دوست کے پانی میں ڈوب جانے کی رعایت سے اپنے خیالات نظم کیے ہیں، 'فاطمہ بنت عبداللہ' میں ایک طرف اپنی خاکستر میں چنگاری دیکھتے ہیں تو دوسری جانب اس کی تربتِ خاموش کو ایک قومِ تازہ کی آغوش قرار دیتے ہیں، 'شبلی و حالی' میں یہ تاثر دینے کی کوشش ہے کہ ابھی تو اہلِ وطن شبلی کی جدائی سے نہیں سنبھل سکے تھے کہ حالی بھی داغِ فرقت دے گئے، 'ہمایوں' میں اختتامِ زندگی کو صبحِ دوامِ زندگی سے تشبیہ دیتے ہیں، اسی طرح 'اکبر، گرامی اور جوہر کے لیے بھی انھوں نے یک تاثری نظمیں کہیں۔ 'اشکِ خون' میں اگرچہ کوئی فکری رَو نہیں ہے، لیکن ہلالِ عید کے پس منظر میں اس غم کی کیفیت کو واضح کرنے کی شعوری کوشش ضرور ملتی ہے۔ جہاں تک 'داغ'، 'صقلیہ'، 'گورستانِ شاہی'، 'فلسفہ غم'، 'والدۂ مرحومہ کی یاد میں' اور 'مسعود مرحوم' کا تعلق ہے، ان میں بعض فلسفیانہ اور فکری مباحث زیرِ بحث آئے ہیں۔ زیرِ نظر سطور میں بالخصوص انھی افکار کی روشنی میں اقبال کی مرثیہ نگاری کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

چوں کہ اقبال کی مذکورہ نظموں کا تعلق کربلائی مرثیوں سے نہیں، اس لیے ان میں 'چہرہ'، 'سراپا'، 'رخصت'، 'آمد'، 'رجز'، 'رزم'، 'شہادت' اور 'بین' جیسے اجزا کا التزام بھی نہیں، بلکہ اقبال کے مرثیے مروّجہ انداز و اسالیب اور تقاضوں سے الگ راستہ اختیار کرتے ہیں۔

اقبال کے کلام میں فکری ارتقا جاری رہا ہے، چنانچہ ان کے ابتدائی خیالات اور ان کے آخری دَور کے افکار مسلسل سفر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ اقبال کی رثائی نظموں میں بھی یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ان کی پہلی نظم 'داغ' سے 'مسعود مرحوم' تک وہ مرثیہ گوئی میں نئی

سمتوں کی طرف گامزن رہے۔ اقبال کے ابتدائی دَور میں یہ سوال ان کے سامنے رہا ہے کہ موت کیا ہے اور اس کے بعد کیا صورتِ احوال ہو گی؟ ان کی پہلی رثائی نظم (داغ) سے قبل 'خفتگانِ خاک سے استفسار' (۱۹۰۲ء) میں بھی یہی خلش مختلف سوالات کی شکل میں نمودار ہوئی ہے۔ مذکورہ نظم کا آخری شعر ان کے تمام سوالات کا نچوڑ ہے:

تم بتا دو ، راز جو اس گنبدِ گرداں میں ہے
موت اِک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انساں میں ہے[۲۷]

اسی طرح ایک اَور نظم 'کنارِ راوی' (نومبر ۱۹۰۵ء) میں وہ زندگی اور موت کے فلسفے کو ایک نئے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ دریا کی روانی، ملاح کی گرم جوشی، رفتارِ جہازِ زندگی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جانے سے یہ نتیجہ اخذ کیا:

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے ، لیکن فنا نہیں ہوتا[۲۸]

اقبال کے مرثیوں میں بالعموم فلسفۂ جبر و قدر اور اس کا ردِعمل، رنج و الم کے مثبت اثرات، فلسفہ حیات و ممات اور عظمتِ انسان کا اظہار پایا جاتا ہے۔ علامہ موت کو اختتامِ حیات سے نہیں، بلکہ تسلسلِ حیات سے تعبیر کرتے ہیں، لہٰذا ان کی اکثر نظمیں موت کے اسی تصور کی حامل ہیں، البتہ اپنی ابتدائی نظموں میں وہ موت کو ایک حقیقت، لیکن تلخ حقیقت کے رُوپ میں قبول کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ اشعار واضح کرتے ہیں کہ موت کی ارزانی کے حوالے سے ان کے لاشعور میں شکایت کا عنصر ضرور موجود ہے۔ 'داغ'، 'گورستانِ شاہی' اور 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آرزو کو خون رُلواتی ہے بیدادِ اجل
مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل
کھل نہیں سکتی شکایت کے لیے لیکن زباں
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستاں[۲۹]

اے ہوس! خوں رو کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار
یہ شرارے کا تبسم ، یہ خس آتش سوار[۳۰]

نَے مجالِ شکوہ ہے ، نَے طاقتِ گفتار ہے
زندگانی کیا ہے! اک طوقِ گلو افشار ہے[۳۱]

'بیدادِ اجل'، 'صیادِ اجل'، 'زندگی بے اعتبار'، 'نَے مجالِ شکوہ'، 'نَے طاقتِ گفتار' اور 'طوقِ گلو افشار' سے اقبال نے موت کی جبریت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے، چنانچہ 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' کے ابتدائی اشعار اقبال کے اسی خیال کی تکرار سے لبریز ہیں۔ وہ نہ صرف کائنات کے ذرّے ذرّے کو تقدیر کا پابند سمجھتے ہیں، بلکہ تدبیر کو بھی مجبوری و بے چارگی قرار دیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ آسمان، چاند، سورج، ستارے بھی مجبور

ہیں۔ایک طرف گلستان میں ہر غنچے کا انجام بکھر جانا ہے تو دوسری جانب سبزہ وگُل کھلنے پر مجبور ہیں؛ غرض ہر شے مجبورِ محض ہے، جیسے:

نغمہ بلبل ہو یا آوازِ خاموشِ ضمی
ہے اسی زنجیرِ عالم گیر میں ہر شے اسیر[۳۲]

نظم کے پہلے بند کے تمام اشعار میں 'مجبور' 'مجبوری' یا 'اسیر' جیسے الفاظ انسان کی لاچارگی اور بے بسی کے آئینہ دار ہیں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے خیال میں ''اس پیہم تکرار سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ اپنی ماں کی وفات کے ردِعمل کے طور پر غم و اندوہ کی جس شدید کیفیت سے وہ دوچار ہوئے، اپنے گرد و پیش کا ذرّہ ذرّہ انھیں اس سے مملو نظر آتا ہے اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی آزادی اور قوتِ ارادی محض ایک فریب ہے۔''[۳۳]

اسی طرح 'مسعود مرحوم' کا آغاز بھی اسی قسم کے خیالات سے ہوتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ معلوم نہیں، چاند، سورج اور ستارے واقعتاً وجود رکھتے ہیں یا یہ سب کچھ محض وہم ہے۔ یہ راستے یا منزلیں کچھ حقیقت بھی رکھتی ہیں کہ محض داستان گوئی کی چیزیں ہیں، کیوں کہ خود سفرِ حیات بے مقصد محسوس ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ مسعود کے اوصاف اور ان کی جدائی پر اپنی کیفیات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ لوگ دوست کے غم میں میری آہ و فغاں کو شاید رسمی شاعرانہ اظہار سمجھ رہے ہیں، یہ ان کی سنگ دِلی ہے۔ یہ ایسا غم ہے کہ 'صبر' سے اس کی تلافی نہیں ہوسکتی:

نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غمِ دوست
نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود[۳۴]

ان کی یہ نظمیں اگرچہ روایتی معنوں میں مرثیہ نہیں، تاہم ان میں بعض مقامات پر آہ و فغاں کی صدا سنائی دیتی ہے اور بعض مواقع پر ماتمی کیفیات کی جھلک دِکھائی دیتی ہے۔ داغ، صفلیہ اور مولانا گرامی کے مرثیوں سے ایک ایک شعر ملاحظہ فرمایئے:

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں مَیں
تُو بھی رو، اے خاکِ دلّی! داغ کو روتا ہوں مَیں[۳۵]

غم نصیب اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا[۳۶]

آہ مولانا گرامی! از جہاں بربست رخت
آنکہ زد فکرِ بلندش آسماں را پشت پاے[۳۷]

ان اشعار سے اقبال کا کرب و اضطراب واضح ہے، وہ بچھڑنے والوں کی جدائی پر گریہ کناں ہیں۔ انھیں موت کی فراوانی اور زندگی کی بے مائیگی کا شدید احساس ہے، مثلاً 'والدۂ مرحومہ کی یاد میں' کے چھٹے بند میں کہتے ہیں کہ اس دنیا میں پیر و جواں سبھی سوگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ باغِ دنیا میں زندگی مشکل، لیکن موت ہوا کی طرح ہر طرف عام ہے۔ جدھر نگاہ جاتی ہے، زلزلے، بجلیاں،

قحط، مصائب اور بیماریاں ہی بیماریاں ہیں۔ جھونپڑی ہو یا محل، بیاباں ہو یا آبادیاں، شہر ہو یا ویرانے، ہر طرف موت ہی موت ہے؛ غرض:

موت ہے ہنگامہ آرا قُلزمِ خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں [۳۸]

لیکن موت کے اس قاہرانہ کردار کے باوجود، وہ زندگی کو زیادہ طاقت ور عنصر سمجھتے ہیں، چنانچہ انھوں نے زندگی کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے عناصر و مظاہرِ کائنات سے تاویلات پیش کی ہیں۔ اقبال کی رثائی نظموں میں، بقول پروفیسر آفاق حسین صدیقی: کائنات میں موت کی ارزانی اور عمومیت کو اس کی بے حیثیتی کی دلیل قرار دے کر موت پر زندگی کی فوقیت ثابت کی گئی ہے اور موت و تخریب کو ایک حیاتِ نو اور ایک بہترین تعمیر کا جواز قرار دیا گیا ہے [۳۹]، اقبال کے ہاں غم کی کیفیت انسان کو مایوسی اور قنوطیت سے دوچار نہیں کرتی، بلکہ اقبال اس سے زندگی کے مثبت اور تعمیری عناصر ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اگرچہ زندگی کی چاروں اور موت کا راج ہے اور بقول اقبال: زندگی ایک طوقِ گلو افشار ہے، تاہم اقبال درد و الم کی اس تاریکی میں امید کی شمع روشن کر لیتے ہیں۔ 'فلسفۂ غم' میں کہتے ہیں:

مرنے والے مرتے ہیں ، لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں [۴۰]

فاطمہ بنت عبداللہ کی شہادت پر اقبال کی رثائی نظم خود اقبال کی دردمندی کو ظاہر کرتی ہے، مگر وہ اس سانحے سے قوم کی حیات کا پیغام کشید کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اے فاطمہ! اگرچہ تیرے غم میں ہم سب اشک بار ہیں، لیکن اس ماتمی کیفیت سے امید کی کرن پھوٹ رہی ہے۔ تیری قبر کی مٹی سے اور اس کے ذرّے ذرّے سے زندگی کی تڑپ اور ملت کی حیاتِ نَو کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں، یعنی:

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں [۴۱]

'والدۂ مرحومہ کی یاد میں' اقبال کی وہ نظم ہے، جس میں رنج و الم کے جذبات پوری شدت کے ساتھ قلم بند ہوئے ہیں۔ اس سانحے نے انھیں احساس دِلا دیا تھا کہ زندگی فریاد اور اشک فشانی کے سوا کچھ بھی نہیں، لیکن وہ مایوس نہیں ہوتے اور پکار اٹھتے ہیں کہ ایک دِن یہ دَورِ امتحان ختم ہو جائے گا، کیوں کہ اس پردۂ فلک کے اُس پار کئی اَور زمانے منتظر ہیں۔ انسان اگر اس دنیا میں بے بس اور لاچار ہے اور مجبورِ آہ و نالہ ہے تو اس کا غم نہیں کرنا چاہیے؛ کیوں کہ بظاہر موت زندگی کو خزاں آشنا کرتی رہتی ہے، لیکن ایک وقت آئے گا کہ زندگی، موت پر غالب آجائے گی۔ اقبال کے خیال میں اگر ہماری رُوح کا شعلہ اس مٹی کے پتلے میں مقید کر دیا گیا ہے تو کوئی غم نہیں اور اگر اس میں ہمارا ٹھکانا بھی عارضی ہے تو بھی کچھ پروا نہیں، کیوں کہ:

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو ، یہ وہ گوہر نہیں [۴۲]

اقبال نے بعض رثائی نظموں میں ماضی کے دیگر حادثات کو بھی پیش کیا ہے۔ 'داغ' میں میرزا غالب، میر مہدی مجروح اور امیر مینائی جیسی ہستیوں کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک داغ رہ گئے تھے، جن کے دم سے دہلی کے دبستانِ شاعری کا

نام باقی تھا:

آج لیکن ، ہم نوا! سارا چمن ماتم میں ہے
شمعِ روشن بجھ گئی ، بزمِ سخن ماتم میں ہے[۴۳]

اسی طرح 'شبلی و حالی' میں حالی کی رحلت پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں
حالی بھی ہو گیا سوے فردوس رہ نورد[۴۴]

شخصی مرثیوں کی طرح مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے ایک مرثیے 'گورستانِ شاہی' میں بھی اقبال نے اسی تصور کو پیش کیا ہے:

ہے ہزاروں قافلوں سے آشنا یہ رہ گزر
چشمِ کوہِ نور نے دیکھے ہیں کتنے تاجور
مصر و بابل مٹ گئے ، باقی نشاں تک بھی نہیں
دفترِ ہستی میں ان کی داستاں تک بھی نہیں
آ دبایا مہرِ ایراں کو اجل کی شام نے
عظمتِ یونان و روما لوٹ لی ایّام نے
آہ! مسلم بھی زمانے سے یونہی رخصت ہوا
آسماں سے ابرِ آذاری اٹھا ، برسا ، گیا[۴۵]

'شبلی و حالی' بظاہر ایک شخصی مرثیہ ہے، لیکن اس میں بھی عظمت مسلم کی داستان سنائی گئی ہے اور ماضی کی شاندار روایات کے پس منظر میں موجودہ عہد کا آشوب بیان کیا گیا ہے۔ اقبال کی اس گفتگو سے مسلمان بے تاب ہو گیا اور اس کے دل میں چھپی ہوئی آہِ سرد ظاہر ہو گئی:

کہنے لگا کہ دیکھ تو کیفیتِ خزاں
اوراق ہو گئے شجرِ زندگی کے زرد
خاموش ہو گئے چمنستاں کے راز دار
سرمایۂ گداز تھی جن کی نوائے درد[۴۶]

مرثیوں کا ایک وصف مرحومین کی صفات اور سیرت کے روشن پہلوؤں اور امتیازی اوصاف کا بیان ہوتا ہے۔ اقبال کی رثائی نظموں میں بھی یہ اوصاف موجود ہیں۔ 'داغ' میں اپنے استاد کی شعری عظمت کو مختلف انداز میں واضح کیا ہے۔ ان کے بانکپن، ان

کے طرزِ بیان کی شوخی، پیری میں جوانی کی حرارت جیسی خصوصیات کس کے کلام میں ملیں گی۔ بادِ صبا سے سکوتِ گُل کا راز پوچھنے اور نالۂ بلبل کا راز جاننے کی صلاحیت کس میں ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ داغ نے تخیل کی بلند پروازی میں بھی حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا، چنانچہ انھوں نے داغ کو ایسے پرندے کی مانند قرار دیا ہے، جس کی نگاہ آسماں کی بے کرانی میں بھی اپنے آشیانے پر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال پکار اٹھتے ہیں:

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن ، مارے گا دل پر تیر کون [۴۷]

اقبال کے عزیز دوست سوامی رام تیرتھ اشنان کرنے کے لیے گنگا میں اترے تو پاؤں پھسل جانے سے سنبھل نہ سکے اور دریا میں ڈوب گئے۔ (بعض روایات کے مطابق سوامی جی نے خودکشی کی تھی۔) اقبال نے ان کی المناک موت کو ان کی زندگی کے جوہر سے منسلک کر دیا:

ہم بغل دریا سے ہے ، اے قطرۂ بے تاب! تُو
پہلے گوہر تھا ، بنا اب گوہرِ نایاب تُو [۴۸]

طرابلس کی جنگ میں کم سن اور بے تیغ و سپر فاطمہ نے مجاہدین کو پانی پلانے کی ذمہ داری کس جرأت سے نبھائی۔ اقبال حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ جرأت فقط خداداد شوقِ شہادت ہی سے ہاتھ آ سکتی ہے۔ سیاسی و تہذیبی اعتبار سے پوری مسلم امہ کی زوال آمادگی کے پیشِ نظر اقبال تعجب کا اظہار کرتے ہیں:

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی ، یا رب! اپنی خاکستر میں تھی [۴۹]

اقبال کی رثائی نظموں میں 'والدۂ مرحومہ کی یاد میں' سب سے منفرد اور سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں انسانی رشتوں کی عظمت اور جذبوں کی شدت بھرپور انداز میں ظاہر ہوئی ہے۔ اقبال اپنی والدہ کی رحلت پر ایک کم سن بچے کی طرح تڑپ تڑپ گئے۔ وہ ایک طرف اپنے موجودہ علمی و سماجی مقام و مرتبے کو دیکھتے ہیں تو دوسری جانب والدہ کی آغوش میں سمٹ جانے کے خواہش مند ہیں۔ اقبال کو معلوم ہے کہ اب کسی کو ان کا انتظار نہیں ہوگا اور نہ ہی کوئی ان کا خط نہ آنے پر بے چین ہوگا۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اب اپنی راتوں کی دعاؤں میں انھیں یاد رکھنے والا کوئی نہیں رہا۔ اپنی والدہ کی شخصیت اور سیرت کے مختلف پہلوؤں کا یوں ذکر کرتے ہیں:

تربیت سے تیری مَیں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مِرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات [۵۰]

اقبال کو اپنے دوست، جسٹس میاں شاہ دین ہمایوں کی وفات پر گہرا صدمہ ہوا۔ ہمایوں عالم و فاضل انسان تھے اور برطانوی ہند میں پنجاب کے پہلے شخص تھے، جو چیف کورٹ کے جج بنے۔ اقبال ان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

اے ہمایوں! زندگی تیری سراپا سوز تھی
تیری چنگاری چراغِ انجمن افروز تھی
گرچہ تھا تیرا تنِ خاکی نزار و دردمند
تھی ستارے کی طرح روشن تری طبعِ بلند
کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورد اِک مشتِ خاکستر میں تھا[۵۱]

اکبر کی رحلت سے اقبال شدید صدمہ سے دوچار ہوئے، لیکن جب ان کا مرثیہ لکھا تو محض ایک مصرعے میں افسوس کا اظہار کیا اور پھر ان کے اوصاف بیان کرنے لگے:

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر — حیاتش بحق بود روشن دلیلے
سرِ ذروۂ طورِ معنی کلیمے — بہ بُت خانۂ دورِ حاضر خلیلے
نوائے سرِگاہ او کارواں را — اذانے درائے ، پیامِ رحیلے
ز دل ھا رباینۂ لات و عزیٰ — بجاں ھا کشایندۂ سلسبیلے
دِماغش ادب خوردۂ عشق و مستی — دِلش پرورِش دادۂ جبرئیلے[۵۲]

اگرچہ مولانا گرامی سے اقبال نہایت بے تکلفی کا اظہار کرتے تھے، لیکن ساتھ ساتھ ان کی علمیت اور ذہانت کے بھی معترف تھے، چنانچہ ان کے مرثیے میں ان کی ذات اور علم وفہم کے بارے میں لکھتے ہیں:

معنی مستور او در لفظ رنگینش نگر
مثل حورے بے حجاب اندر بہشت دلکشاے
از نواے جاں فزاے او عجم را زندگی
جامِ جمشید از شرابِ ناب او گیتی نماے[۵۳]

مولانا محمد علی جوہر کا انتقال ہوا تو اقبال نے بڑی دردمندی سے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ مفتی اعظم فلسطین (سید امین الحسینی) کے اصرار پر جوہر کو بیت المقدس کے ایک مشرقی حجرے میں دفن کیا گیا تو اقبال نے کہا:

خاکِ قدس او را بآغوشِ تمنا در گرفت
سوے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت[۵۴]

'مسعود مرحوم' میں اگرچہ براہِ راست توصیف نہیں، لیکن اقبال نے بالواسطہ اپنے دوست کے کمالات اور علم و ہُنر کا بلیغ ذکر کیا ہے:

رہی نہ ، آہ ، زمانے کے ہاتھ سے باقی
وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
زوالِ علم و ہُنر مرگِ ناگہاں اُس کی
وہ کارواں کا متاعِ گراں بہا مسعود[۵۵]

اقبال نے موت کی ارزانی اور جبریت کے باوجود، بقول پروفیسر آفاق حسین صدیقی: موت کے مقابلے میں زندگی کی اہمیت کا تصور ابھارا ہے اور زندگی کی اہمیت کے تصور کو استحکام عطا کرنے کے لیے حیات و کائنات کے مظاہر سے فلسفیانہ تاویلات دی ہیں۔[۵۶]

'فلسفۂ غم' میں اقبال نے موت کو ایک ندّی سے تشبیہ دی ہے، جو چٹانوں سے گرتی ہے تو کچھ فاصلے تک منتشر بوندوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے، لیکن تھوڑی دُور جا کر وہ سب قطرے باہم مل جاتے ہیں اور دوبارہ ندّی کا رُوپ دھار لیتے ہیں۔ اقبال کہتے ہیں:

پستیِ عالم میں مِلنے کو جدا ہوتے ہیں ہم
عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم[۵۷]

'والدۂ مرحومہ کی یاد میں' کے آٹھویں بند میں اقبال حیات و ممات کا فلسفیانہ تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی قدرت کو اس قدر محبوب ہے کہ ہر چیز میں حفظِ حیات کا جذبہ رکھ دیا ہے۔ ان کے خیال میں: اگر موت کے ہاتھوں زندگی کو خطرہ درپیش ہوتا تو اسے نظامِ کائنات میں اتنا عام نہ کر دیا جاتا۔ نیند کی طرح موت سے بھی زندگی کو کچھ خطر نہیں، کیوں کہ موت کا مقصد خاتمۂ حیات نہیں، بلکہ اس میں کچھ اَور ہی راز پوشیدہ ہے۔ سطحِ آب پر بننے والا بلبلہ ہَوا کے ایک تھپیڑے سے مٹ جاتا ہے اور موج فوراً اسے اپنے دامن میں چھپا لیتی ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر ہَوا دوبارہ بلبلہ پیدا نہ کر سکتی تو پہلے بنائے ہوئے بلبلے کو کبھی نہ ختم کرتی۔ اس ساری تمثیل سے اقبال یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

اس روِش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر
یہ تو حجت ہے ہَوا کی قوتِ تعمیر پر
فطرتِ ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو
خوب تر پیکر کی اس کو جستجو رہتی نہ ہو[۵۸]

'ہمایوں' میں زندگی کی ناپایداری اور موت کی جبریت کے حوالے سے اقبال نے محض ایک شعر میں نہایت بلیغ اشارہ دیا ہے،

کہتے ہیں:

موت کی لیکن دلِ دانا کو کچھ پروا نہیں
شب کی خاموشی میں جُو ہنگامۂ فردا نہیں[۵۹]

اقبال کی یہ نظمیں بعض ہستیوں کی یاد میں لکھی گئی ہیں۔ اقبال موت کی اس ارزانی سے عظمت انسان کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ اقبال سمجھتے ہیں کہ اگرچہ ستاروں کی طویل عمر کے مقابلے میں مختصر انسانی زندگی کچھ نسبت نہیں رکھتی، لیکن انسان کی نظر آسمانوں سے بھی اُس پار جاتی ہے۔ انسان، جس کے دم سے کائنات بارونق ہے، اس کے وسعتِ خیال میں آسمان کی حیثیت ایک نقطے سے زیادہ نہیں۔ اسے نادان کہا جاتا ہے، لیکن صداقت کی تلاش میں وہ مسلسل بے چین رہتا ہے۔ دراصل یہی وہ ہستی ہے، جس کا ناخن سازِ ہستی کے لیے مضراب کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کی ان رفعتوں کے پیش نظر اقبال سوال کرتے ہیں:

شعلہ یہ کم تر ہے گردُوں کے شراروں سے بھی کیا
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا[۶۰]

یوں دیکھا جائے تو اقبال کو اپنی والدہ اور دیگر بہت سی عزیز و محترم ہستیوں کے بچھڑ جانے سے شدید صدمات برداشت کرنا پڑے۔ اس المناک صورتِ حال سے زندگی پر ان کے اعتقاد کو ٹھیس پہنچنے کے بجائے زندگی پر ان کا اعتماد فزوں ہوتا گیا، چنانچہ موت کی فراوانی سے ان کے ہاں زندگی کے اہم ہونے کا احساس بڑھا اور ساتھ ہی انسانی عظمت پر ان کا ایمان پختہ ہوتا گیا۔ اقبال کے ہاں مرثیہ نگاری کا تصور روایتی معنوں میں نہیں اور یہ کہ اقبال کی رثائی نظمیں بھی آہ و فغاں اور گریہ و زاری کے لیے نہیں، بلکہ ان کے رجائیت پسندانہ رویے سے عبارت ہیں۔ درحقیقت یہ مرثیہ نما نظمیں موت کی تمام تر جبریت کے باوجود مثبت اور تعمیری فکر کی حامل ہیں۔

حواشی

۱۔ رفیع الدین ہاشمی: اصنافِ ادب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء، ص ۵۰

۲۔ غلام رسول مہر: مطالبِ کلامِ اقبال اردو، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۷ء، ص ۱۳۳

۳۔ اسلوب احمد انصاری، پروفیسر: اقبال کی تیرہ نظمیں، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۴۷

۴۔ عبدالحق، ڈاکٹر (مرتب): اقبال کے شعری اسالیب، دہلی: شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۸۹ء، ص ۵۲

۵۔ نظم کے لیے ملاحظہ کیجیے..... صابر کلوروی، ڈاکٹر: کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء، صفحات ۴۹-۶۳

۶۔ نظم کے لیے ملاحظہ کیجیے..... ایضاً، صفحات ۱۰۲-۱۰۳

۷۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر: زندہ رُود، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، دوم ۲۰۰۸ء، ص ۹۳

۸۔ غلام رسول مہر: مطالبِ کلامِ اقبال اردو، محولہ بالا ۲، ص ۱۳۳

۹۔ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، سوم ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۵-۱۱۷

۱۰۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر: عروجِ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۷۸ء، ص ۹۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۰۱

۱۲۔ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو، محولہ بالا ۹، ص ۱۳۹-۱۴۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۸۲-۱۸۴

۱۴۔ غلام رسول مہر: مطالبِ کلامِ اقبال اردو، محولہ بالا ۲، ص ۳۵۹

۱۵۔ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو، محولہ بالا ۹، ص ۲۴۳-۲۴۴

۱۶۔ محمد عبداللہ قریشی: معاصرین اقبال کی نظر میں، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص ۸۸

۱۷۔ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو، محولہ بالا ۹، ص ۲۵۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۲۵۴-۲۶۶

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۸۲

۲۰۔ نظم کے لیے دیکھیے: 'گرامی کی وفات پر'، مشمولہ سرودِ رفتہ مرتبہ غلام رسول مہر+صادق علی دلاوری، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۹ء، ص ۱۹۳

۲۱۔ محمد کاظم: یادیں اور باتیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۷۱

۲۲۔ نظم کے لیے ملاحظہ کیجیے: سرودِ رفتہ، محولہ بالا ۲۲، ص ۱۹۲

۲۳۔ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو، محولہ بالا ۹، ص ۷۲۳-۷۲۶

۲۴۔ علامہ محمد اقبال: اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۵ء، ص ۲۵۰

۲۵۔ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو، محولہ بالا ۹، ص ۱۵۹-۱۶۰

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۷۴-۱۷۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۷۱

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۲۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۷۷

۳۱۔ ایضاً،ص ۲۵۹

۳۲۔ ایضاً،ص ۲۳۸

۳۳۔ رفیع الدین ہاشمی:اصنافِ ادب،محولہ بالا ۱،ص۴۸

۳۴۔ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو،محولہ بالا ۹،ص۲۳۷

۳۵۔ ایضاً،ص ۱۶۶

۳۶۔ ایضاً،ص ۱۶۰

۳۷۔ علامہ محمد اقبال: سرودِ رفتہ ،محولہ بالا۲۲ ،ص۱۹۳

۳۸۔ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو،محولہ بالا ۹،ص۲۵۸-۲۵۹

۳۹۔ عبدالحق،ڈاکٹر (مرتب): اقبال کے شعری اسالیب،محولہ بالا۴،ص۶۲

۴۰۔ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو،محولہ بالا ۹،ص۱۸۴

۴۱۔ ایضاً،ص۲۴۳

۴۲۔ ایضاً،ص ۲۵۹-۲۶۰

۴۳۔ ایضاً،ص ۱۵۵-۱۶۱

۴۴۔ ایضاً،ص ۲۵۰

۴۵۔ ایضاً،ص ۱۷۸

۴۶۔ ایضاً،ص ۲۵۰

۴۷۔ ایضاً،ص ۱۱۶-۱۱۷

۴۸۔ ایضاً،ص ۱۳۹

۴۹۔ ایضاً،ص۲۴۳

۵۰۔ ایضاً،ص ۲۵۷

۵۱۔ ایضاً،ص۲۸۲

۵۲۔ علامہ محمد اقبال: پیامِ مشرق، لاہور: شیخ مبارک علی تاجرانِ کتب ، اوّل مئی۱۹۲۳ء،ص ۱۱۹

۵۳۔ علامہ محمد اقبال: سرودِ رفتہ ،محولہ بالا۲۲ ،ص۱۹۳

۵۴۔ ایضاً،ص۱۹۲

۵۵۔ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو، محولہ بالا ۹، ص۲۳۷

۵۶۔ ڈاکٹر عبدالحق (مرتب): اقبال کے شعری اسالیب، محولہ بالا۴، ص۶۲

۵۷۔ علامہ محمد اقبال: کلیاتِ اقبال اردو، محولہ بالا ۹، ص۱۸۴

۵۸۔ ایضاً، ص۲۶۱

۵۹۔ ایضاً، ص۲۸۲

۶۰۔ ایضاً، ص۲۶۱-۲۶۲

کتابیات

۱۔ اسلوب احمد انصاری، پروفیسر: اقبال کی تیرہ نظمیں، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء

۲۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر: عروجِ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۷۸ء

۳۔ اقبال، علامہ محمد: پیامِ مشرق، لاہور: شیخ مبارک علی تاجرانِ کتب، اوّل مئی۱۹۲۳ء

۴۔ اقبال، علامہ محمد: کلیاتِ اقبال اردو، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، سوم ۱۹۹۵ء

۵۔ رفیع الدین ہاشمی: اصنافِ ادب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء

۶۔ صابر کلوروی، ڈاکٹر (مرتب): کلیاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء

۷۔ عبدالحق، ڈاکٹر (مرتب): اقبال کے شعری اسالیب، دہلی: شعبہ اردو، دہلی یونی ورسٹی، ۱۹۸۹ء

۸۔ عطاء اللہ، شیخ (مرتب): اقبال نامہ، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۵ء

۹۔ قمر رئیس، ڈاکٹر+ خلیق انجم، ڈاکٹر: اصنافِ ادبِ اردو، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۱۱ء

۱۰۔ محمد عبداللہ قریشی: معاصرین اقبال کی نظر میں، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء

۱۱۔ محمد کاظم: یادیں اور باتیں، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

۱۲۔ مہر، غلام رسول: مطالبِ کلامِ اقبال اردو، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۹۷ء

۱۳۔ مہر، غلام رسول+ صادق علی دلاوری (مرتبین): سرودِ رفتہ، لاہور: کتاب منزل، ۱۹۵۹ء